مولانا عبدالرحمٰن کیلانی
قسط ۳

عجمی تصورات کا دوسرا دور!

ایمان بالغیب
(و)
نظریہ ارتقاء

فرشتوں پر ایمان:

فرشتوں پر ایمان لانا ایمان کا ایک جز ہے۔ اور قرآن میں اس کی صراحت کئی مقامات پر موجود ہے کہ فرشتے اپنا خارجی وجود اور ذاتی تشخص رکھتے ہیں۔ وہ فرشتے آسمان سے نیچے بھی اترتے ہیں زمین سے اوپر آسمان کو چڑھتے بھی ہیں۔ جبرئیل اور میکائیل انہی میں سے ہیں۔ پھر کچھ فرشتے دو۔ دو، تین تین چار چار پروں والے بھی ہیں۔ فرشتوں نے بدر کے میدان میں مسلمانوں کی مدد بھی کی تھی وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب چیزیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ فرشتوں کا خارجی وجود ضرور ہے لیکن چونکہ وہ غیر مرئی مخلوق ہیں جیسے ہوا۔ لہٰذا وہ ہمیں نظر نہیں آتے۔ لہٰذا مسلمانوں کو، اور اسی طرح یہود و نصاریٰ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ ان پر ایمان لائیں۔ اُن پر ایمان لانا "ایمان بالغیب" کا ایک حصہ ہے۔ لیکن سید صاحب موصوف فرشتوں کے خارجی وجود کے منکر ہیں، اور ان کا انکار اس بناء پر ہے کہ وہ محسوسات و مشاہدات کی زد سے باہر ہیں۔ نیز" ڈاروِن کے نظریہ ارتقاء کا بھی یہی تقاضا ہے۔ پھر چونکہ ابلیس بھی فرشتوں کی صف میں تھا۔ لہٰذا اس کے خارجی وجود سے بھی آپ نے انکار کر دیا۔ آپ اپنی تفسیر القرآن ج ۱ ص ۴۲ پر ارشاد فرماتے ہیں:

"خدا تعالیٰ نے جو اپنے جاہ و جلال اور اپنی قدرت اور اپنے افعال کو فرشتوں سے نسبت کرتا ہے تو جن فرشتوں کا قرآن میں ذکر ہے ان کا کوئی اصلی وجود نہیں ہو سکتا۔ بلکہ خدا کی بے انتہاء قدرتوں کے ظہور کو اور ان قوٰی کو جو خدا نے اپنی ساری مخلوق میں مختلف قسم کے پیدا کیے ہیں، مَلک یا ملائکہ کہا ہے جن میں سے ایک ابلیس یا شیطان بھی ہے۔ پہاڑوں کی صلابت، پانی کی رقت، درختوں کی قوتِ نمو، برق کی قوتِ جذب و دفع، غرضیکہ تمام قوٰی جن سے مخلوقات موجود ہوئی ہیں اور جو مخلوقات میں ہیں

وہی ملک وملائکہ ہیں جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے۔ انسان ایک مجموعہ قوائے ملکوتی اور قوائے بہیمی کا ہے۔ اور ان دونوں قوتوں کی بے انتہا ذرّیات ہیں، جو ہر ایک قسم کی نیکی وبدی میں ظاہر ہوتی ہیں۔ اور انسان کے فرشتے اور ان کی ذرّیات اور وہی انسان کے شیطان اور ان کی ذرّیات ہیں۔" (ایضاً ص ۴۲)

سرسید کے خیالات کے مآخذ:

پھر آپ فرماتے ہیں:

"بعض اکابرِ اسلام کا بھی یہی مذہب ہے جو میں کہتا ہوں۔ اور امام محی الدین ابن عربی نے فصوص الحکم میں یہی مسلک اختیار کیا ہے۔ شیخ عارف باللہ مؤید الدین ابن محمود المعروف بالہدیٰ نے، جو مریدانِ خاص شیخ صدرالدین قونوی، مرید امام محی الدین ابنِ عربی سے ہیں۔ شرح فصوص الحکم میں بہت بڑی بحث لکھی ہے۔" (ایضاً۔ ص ۴۴)

یہ جو اکابرِ اسلام سید صاحب نے گنوائے ہیں۔ یہ دراصل ابنِ عربی (۶۳۸ھ) ابنِ عربی کے مرید خاص صدرالدین قونوی اور اس کے مرید شیخ عارف باللہ ہیں۔ ابن عربی گروہ صوفیہ کی معروف شخصیت ہیں اور صوفیہ میں شیخ اکبر کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ ابنِ عربی نے بھی تصوف میں چند نئے نظریات کو داخل کیا تھا۔ مثلاً

۱۔ یہ کہ نبوّت وہبی نہیں بلکہ اکتسابی چیز ہے۔ اور عقل کو اپیل کرنے کی وجہ سے سید صاحب نے بھی اس نظریہ کو اپنایا ہے۔

۲۔ یہ کہ نبوّت چونکہ اکتسابی ہے۔ لہٰذا تاقیامت جاری رہے گی۔ مرزائے قادیاں نے بھی ابنِ عربی کی تحریروں سے فائدہ اٹھایا ہے۔

۳۔ یہ کہ ولایت کا مقام نبوّت سے بھی آگے نکل جاتا ہے۔ اس کے خیال کے مطابق سب سے نچلا درجہ رسالت کا ہے۔ پھر اس سے اوپر نبوّت کا پھر اس سے اوپر ولایت کا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے ؎

مقام النبوّۃ فی برزخ ! فویق الرسول ودون الولی !

"نبوّت کا مقام درمیان میں ہوتا ہے جو رسول سے اوپر اور ولی سے نیچے ہوتا ہے۔
ابن عربی اس کی دلیل یہ دیتے تھے کہ رسول یا نبی سے تو اللہ تعالیٰ فرشتہ کے ذریعہ بات چیت

کرتا ہے۔ لیکن ولی سے یہ بات پیت فرشتہ کے واسطہ کے بغیر ہوتی ہے۔ نیز نبی ہو یا رسول۔ اس کا ایک مخصوص مقام ہوتا ہے جس سے آگے وہ تجاوز نہیں کر سکتا۔ جبکہ ولی واصل بحق بھی ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ولایت نبوت سے افضل ہے۔

۴۔ خاتم الانبیاء کی طرح خاتم الاولیاء بھی ایک منصب ہے۔ اور چونکہ نبوت سے ولایت افضل ہے۔ لہٰذا خاتم الانبیاء سے خاتم الاولیاء افضل ہوتا ہے۔ اور موجودہ دور کا خاتم الاولیاء میں ہوں۔ چنانچہ ؎

انا خاتم الولایة دون شك لورث الهاشمی مع المسیح!

"بیشک میں خاتم الاولیاء ہوں۔ کیونکہ مجھے ہاشمی ولایت کے ساتھ مسیحی ولایت بھی حاصل ہے"

۵۔ اور اس کا پانچواں نظریہ یہ تھا کہ انسان کو سب سے زیادہ معرفتِ الٰہی اس وقت حاصل ہوتی ہے جب وہ کسی عورت سے جماع میں مشغول ہوتا ہے۔[1]

انہی نظریات کی وجہ سے علمائے دین نے اس پہ کفر کا فتویٰ لگایا اور حکومتِ مصر کو اس کے خیالات سے مطلع کر دیا۔ جب اس بات کی ابنِ عربی کو خبر ہوئی تو ابنِ عربی نے وہاں سے بھاگ کر دمشق میں آکر پناہ لی۔

ابنِ عربی فلسفہ وحدت الوجود کا سب سے بڑا پرچارک تھا جو صوفیہ کا مشہور ترین نظریہ ہے۔ اسی وجہ سے صوفیہ اسے شیخ اکبر کے معزز لقب سے یاد کرتے ہیں۔ ان کی تصانیف میں سے دو کتب فتوحاتِ مکیہ اور فصوص الحکم زیادہ مشہور ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی، جو خود بھی صوفیہ میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔ ان کتابوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"ہمیں نص سے کام ہے فص سے نہیں۔ اور فتوحاتِ مدنیہ نے ہمیں فتوحاتِ مکیہ سے بے نیاز کر دیا ہے"

سو یہ ہیں محی الدین ابن عربی اور ان کے مرید صدر الدین قونوی اور ان کے مرید عارف باللہ شارح فصوص الحکم۔ جن کو سید صاحب اکابرِ اسلام کا نام دے کر اُن سے استفادہ فرما رہے ہیں کہ انھوں نے بھی ملائکہ کے ذاتی تشخص کو تسلیم نہیں کیا۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"شیخ نے اپنے مکاشفہ سے اِن جزئیات کے کلیات کو جانا ہوگا۔ مگر چونکہ وہ مکاشفہ

---

[1] ان نظریات کے فلسفہ، تفصیل اور حوالہ جات کے لیے میری تصنیف دینِ طریقت ملاحظہ فرمائیے۔

ہم کو حاصل نہیں ہے، اس لئے ہم انھیں قویٰ کو جن کو شیخ اور ان کے متبع ذریات ملائکہ قرار دیتے ہیں، ملائکہ کہتے ہیں۔ مطلب ایک ہے صرف لفظوں یا جاننے کا ہیر پھیر ہے۔ شیطان کی نسبت تو قیصری شرح فصوص میں نہایت صاف صاف وہی بات لکھی ہے، جو ہم نے کہی ہے۔" (تفسیر القرآن ج ۱ ص ۲۴)

ان حوالہ جات سے یہ بات بہر حال واضح ہو جاتی ہے کہ سید صاحب نے فرشتوں اور ابلیس سے انکار کے ثبوت میں کس طرح کے "اکابر اسلام" سے استفادہ کیا ہے۔

آپ حیران ہوں گے کہ ابن عربی اور اس کے مرید جو طبقہ صوفیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ولایت کا معیار ہی کرامات سمجھتے ہیں۔ دوسری طرف سرسید جیسے تجربہ پرست ہیں جو کرامات تو کیا معجزات کے بھی منکر ہیں، پھر یہ دونوں فرشتوں اور ابلیس کے خارجی وجود سے انکار کے مسئلہ پر متفق کیونکر ہو گئے؟ تو گزارش ہے کہ ابن عربی اور اس کے حواریوں کی ضرورت اور تھی اور سرسید کی ضرورت دوسری ہے۔ ابن عربی کا گروہ شیطان کی دشمنی سے نفس کشی، چلے اور ریاضت و مجاہدہ مراد لیتا ہے اور ملکوتی قوتوں یا ملائک کو انسان کے اندر ثابت کر کے فرشتوں کے بجائے خود آسمانوں کی طرف روحانی پرواز کرتا ہے۔ البتہ یہ گروہ خارجی قوتوں کو ملائکہ سے تعبیر نہیں کرتا۔ جبکہ سرسید کو ملائکہ اور ابلیس انسان کے اندر ہی تسلیم کرنے اور خارجی وجود سے انکار کی ضرورت یہ پیش آئی کہ اس تاویل کے بغیر نظریہ ارتقاء کو اسلامی تعلیم میں فٹ کرنا مشکل تھا۔ لہٰذا دونوں گروہوں نے الگ الگ مقاصد کے پیش نظر فرشتوں، ابلیس اور شیطان کے ذاتی تشخص اور خارجی وجود سے انکار کر دیا۔

اس کی مثال یوں سمجھیے جیسے مادہ پرست فلاسفر اور مذہب پرست صوفی متضاد نظریات و عقائد رکھنے کے باوجود دونوں نظریہ وحدت الوجود کے قائل ہیں۔ البتہ وحدت الوجود کا مفہوم اور اغراض و مقاصد دونوں کے الگ الگ ہیں۔ فلاسفر کثرت سے وحدت کی تلاش میں مادہ تک پہنچتے ہیں۔ اور اسے ہی علت العلل قرار دیتے ہیں۔ ان کے ہاں ساری کائنات مادہ سے وجود میں آئی ہے اور یہی نظریہ وحدت الوجود ہے۔ جبکہ صوفیہ کے ہاں علت العلل تو خدا کی ذات ہے مگر وہ کائنات کی ہر چیز کو اس کا حصہ قرار دیتے ہیں۔ ان کے ہاں ایسا نظریہ وحدت الوجود کہلاتا ہے۔ بعینہٖ اسی طرح ابن عربی، سرسید فرشتوں اور ابلیس کے خارجی وجود سے انکار اور انسان کے اندر مختلف قویٰ موجود ہونے کی حد تک تو متفق ہیں، مگر مقاصد دونوں کے الگ الگ ہیں۔

فرشتوں کے ذاتی تشخص کے دلائل :

اب سوال یہ ہے کہ اگر ملائکہ سے مراد کائنات کی مختلف خارجی قوتیں اور انسان کے اندر نیکی پیدا کرنے والی قوتیں مراد ہیں۔ تو اِن قوتوں کو مسلمان کیا ہر انسان حتیٰ کہ دہریے بھی تسلیم کرتے ہیں۔ پھر یہ فرشتوں پر ایمان بالغیب کیا ہُوا؟ اور اس آیت کا مطلب کیا ہوگا :

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بما انزل الیہ من ربہ و المؤمنون۔ کلٌ اٰمن باللہ وملٰئکتہ وکتبہ ورسلہ۔ (البقرۃ ۲ / ۲۸۵)	رسول اس کتاب پر جو اُس کے ربّ کی طرف سے اس پر نازل ہوئی۔ ایمان رکھتے ہیں۔ ہر ایک اللہ اسکے فرشتوں، اسکی کتابوں اور رسولوں پر ایمان لایا۔

اب دیکھئے درج ذیل آیت فرشتوں کے خارجی وجود کے ثبوت میں کیسی صاف ہے :

وقال الذین لا یرجون لقاءنا لولا انزل علینا الملٰئکۃ او نریٰ ربنا۔ (الفرقان ۲۵ / ۲۱)	اور جو لوگ ہم سے ملنے کی امید نہیں رکھتے کہتے ہیں کہ ہم پر فرشتے کیوں نہ نازل کئے گئے یا ہم اپنی آنکھ سے اپنے پروردگار کو دیکھ لیں۔

گویا اس دَور کے کفار و مشرکین فرشتوں کے خارجی وجود کے اس طرح قائل تھے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کے خارجی وجود کے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اُن کو جواب یہ دیا کہ :

یوم یرون الملٰئکۃ لا بشریٰ یومئذ للمجرمین۔ (الفرقان ۲۵ / ۲۲)	جس دن یہ فرشتوں کو دیکھیں گے اس دن گنہگاروں کے لیے کوئی خوشی کی بات نہ ہوگی۔

تو کیا یہ سب سوال وجواب محض خارجی یا باطنی قوتوں سے متعلق ہی ہو رہے ہیں۔ باطنی قوتیں تو کم وبیش ہر شخص میں اور ایسے ہی کفار میں بھی موجود ہوتی ہیں۔ پھر آخر ان کا مطالبہ کیا تھا؟

نیز یہ بات تو سید صاحب بھی تسلیم کرتے ہیں کہ عبد کا لفظ رُوح اور جسم کے مرکب پر بولا جاتا ہے (دیکھیے تفسیر القرآن۔ واقعہ اسراء) اس کا استعمال نہ تو صرف رُوح پر ہو سکتا ہے۔ نہ صرف جسم پر اور نہ ہی خارجی یا باطنی قوتوں پر۔ اب دیکھئے قرآن کریم نے جیسے عبد کا لفظ انسانوں کے لیے استعمال کیا ویسے ہی فرشتوں کے لیے بھی استعمال کیا ہے۔ ارشاد باری ہے :

وجعلوا الملٰئکۃ الذین ھم عباد الرحمٰن اناثا۔ (الزخرف ۴۳ / ۱۹)	اور انھوں نے فرشتوں کو کہ وہ بھی خدا کے بندے ہیں اناث (خدا کی بیٹیاں) مقرر کیا۔

جبریلؑ کی حقیقت اور نبوت کا مقام :

اب دیکھنا یہ ہے کہ اگر فرشتوں کے ذاتی تشخص سے انکار کر دیا جائے تو جبریلؑ کے متعلق — جو فرشتوں میں ایک ممتاز شخصیت ہیں اور تمام انبیاءؑ پر خدا کی طرف سے وحی لے کر نازل ہوتے ہیں — سید صاحب کا کیا نظریہ ہے ؟ چنانچہ آپ تفسیر القرآن ج ۱ صفحہ ۲۳ پر ارشاد فرماتے ہیں :

"نبوت در حقیقت ایک فطری چیز ہے جو انبیاء میں بمقتضاء ان کی فطرت کے مثل دیگر قویٰ انسانی کے ہوتی ہے ۔ جس انسان میں وہ قوت ہوتی ہے وہ نبی ہوتا ہے ، اور جو نبی ہوتا ہے اُس میں وہ قوت ہوتی ہے ۔ جس طرح کہ تمام ملکات انسانی اس کی ترکیب اعضاء دل و دماغ و خلقت کی مناسبت سے علاقہ رکھتے ہیں ۔ اسی طرح ملکہ نبوت بھی اس سے علاقہ رکھتا ہے ۔ بعض دفعہ کوئی خاص ملکہ کسی خاص انسان میں از روئے خلقت و فطرت کے ایسا قوی ہوتا ہے کہ وہ اس کا امام یا پیغمبر کہلاتا ہے ۔ لوہار بھی اپنے فن کا امام یا پیغمبر ہو سکتا ہے ۔ اسی طرح ایک شاعر یا ایک طبیب بھی اپنے فن کا امام یا پیغمبر ہو سکتا ہے ۔ مگر جو شخص روحانی امراض کا طبیب ہوتا ہے اور جس میں اخلاق انسانی کی تعلیم و تربیت کا ملکہ بمقتضائے اس کی فطرت کے خدا سے عنایت ہوتا ہے وہ پیغمبر کہلاتا ہے ۔ اور جس طرح کہ اور قوائے انسانی بمناسبت اس کے اعضاء کے قوی ہوتے جاتے ہیں ، اسی طرح یہ ملکہ بھی قوی ہوتا جاتا ہے ۔ اور جب وہ اپنی پوری قوت پر پہنچ جاتا ہے تو اس سے وہ ظہور میں آتا ہے جس کو عرفِ عام میں بعثت سے تعبیر کرتے ہیں ۔"　　(ایضاً ص ۲۴)

"خدا اور پیغمبر میں بجز اس ملکہ نبوت کے جس کو ناموس اکبر اور زبان شرع میں جبرئیل کہتے ہیں اور کوئی ایلچی پیغام پہنچانے والا نہیں ہوتا ۔ اس کا دل ہی وہ آئینہ ہوتا ہے جس میں تجلیات ربانی کا جلوہ دکھائی دیتا ہے ۔ اس کا دل بھی وہ ایلچی ہوتا ہے جو خدا کے پاس پیغام لے جاتا ہے اور خدا کا پیغام لے کر آتا ہے ۔ وہ خود ہی وہ مجسم چیز ہوتا ہے جس میں خدا کے کلام کی آوازیں نکلتی ہیں ۔ وہ خود ہی وہ کان ہوتا ہے جو خدا کے بے حرف و بے صوت کلام کو سنتا ہے ۔ خود اس کے دل سے فوارہ کی مانند وحی اٹھتی ہے اور خود اسی پر نازل ہوتی ہے ۔ اس کا عکس اس کے دل پر پڑتا ہے جس کو وہ خود ہی الہام کہتا ہے

اس کو کوئی نہیں بلواتا، بلکہ وہ خود بولتا ہے اور خود ہی کہتا ہے: وما ینطق عن الھوٰی ان ھو الا وحی یوحی .... ہزاروں شخص ہیں جنھوں نے مجنونوں کی حالت دیکھی ہوگی وہ بغیر بولنے والے کے اپنے کانوں سے آوازیں سنتے ہیں۔ تنہا ہوتے مگر اپنی آنکھوں سے اپنے پاس کسی کو کھڑا ہوا دیکھتے ہیں.... باتیں سنتے ہیں اور باتیں کرتے ہیں.... ہاں ان دونوں میں اتنا فرق ضرور ہے کہ پہلا مجنوں ہے اور دوسرا پیغمبر۔ گو کہ کافر پچھلے کو بھی مجنوں بتاتے تھے۔" (ایضاً ص ۲۵)

"خدا نے بہت سی جگہ قرآن مجید میں جبریل کا نام لیا ہے۔ مگر سورۂ بقرہ میں اس کی ماہیت بتادی ہے جہاں فرمایا ہے کہ جبریلؑ نے تیرے دل میں قرآن کو خدا کے حکم سے ڈالا ہے دل پر اتارنے والی یا دل میں ڈالنے والی چیز وہی ہوتی ہے جو خود انسان کی فطرت میں ہو نہ کوئی دوسری چیز جو فطرت سے خارج اور خود اس کی خلقت سے جس کے دل پر ڈالی گئی ہو، جداگانہ ہو۔" (ایضاً ص ۲۵)

فطری ملکہ اور نبوت میں فرق:

سید صاحب کا یہ نادر انکشاف کئی لحاظ سے غلط ہے:

۱۔ یہ فطری ملکہ جو ابتدا میں ابتدائے فطرت سے ہوتا ہے تو اس کا اظہار بھی ابتدا ہی سے ہونا چاہیے مثل مشہور ہے "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" شاعر نابغہ اور فطین قسم کے لوگ جو ابتدائے فطرت سے یہ ملکہ لے کر پیدا ہوتے ہیں، تو ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ ایک مدت معینہ تو انھیں خود بھی اور دوسروں کو بھی ان کے اس "ملکۂ فطرتی" کا علم تک ہی نہ ہو اور عمر کے ایک خاص حصہ میں اس کا پوری شدّ و مدّ سے ظہور شروع ہوجائے۔ یہ چیز فطرت کے خلاف ہے۔ لیکن انبیاء میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک معین مدت تک نہ انھیں خود ہی "وحی" کے نزول کا علم ہوتا ہے اور نہ ہی دوسروں کو ایسا گمان ہوتا ہے کہ اس میں "وحی" والا فطرتی ملکہ موجود ہے۔

۲۔ اس فطری ملکہ کا جب ظہور شروع ہوجاتا ہے تو اس میں بدستور ارتقاء کا عمل جاری رہتا ہے اور وہ دو طرح سے ہوتا ہے:

(ا) اس خاص فن میں مزید کمال حاصل ہوتا ہے۔

(ب) تجربہ کی بنا پر اس کے نظریات میں تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے۔

اب ان باتوں کو ہم ایک مثال سے واضح کرتے ہیں، علامہ اقبال مرحوم کے متعلق یہ تو مسلمہ امر ہے

کہ ان میں شعر کا فطری ملکہ موجود تھا۔ اب دیکھئے انہوں نے بچپن ہی میں کسی بچّہ کو مخاطب کرکے ایک نظم کہی تھی، جس کا پہلا شعر یہ ہے ؎

میں نے چھینا تجھ سے چاقو اور چلاتا ہے تو
مہرباں ہوں میں مگر نا مہرباں سمجھا ہے تو

اب دیکھیے یہ نظم انہوں نے بچپن ہی میں کہہ دی تھی جس سے صاف ظاہر ہے کہ فطری ملکہ اپنے اظہار کیلیے عمر کی پختگی کا انتظار نہیں کیا کرتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ علامہ موصوف کے آخری زندگی کے شعر بلحاظ شعریت اس نظم سے بدرجہا بلند ہیں۔ مثلاً ؎

سمجھتی ہیں مآلِ گل، مگر کیا زورِ فطرت ہے
سحر ہوتے ہی کلیوں کو تبسّم آ ہی جاتا ہے

گویا اس خاص ملکہ فطری میں بھی ارتقاء و پختگی کا عمل جاری رہتا ہے۔ جیسا کہ مندرجہ بالا دونوں شعروں میں بلحاظ سلاست و شعریت زمین آسمان کا فرق ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ آپ کے نظریاتِ زندگی بدلتے رہتے تھے ایک وقت تھا جب علامہ موصوف پکے نیشنلسٹ یا وطن پرست تھے۔ اس وقت آپ نے یہ شعر کہا ؎

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

پھر جب آپ وطن پرست کی بجائے اسلام پرست یا "مسلم" بن گئے تو آپ کا نعرہ یہ تھا ؎

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا!
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

پھر اس نظریہ میں اس قدر پختہ ہوتے کہ مولانا حسین احمد مدنی مہتمم دارالعلوم دیوبند نے انگریزوں کو وطن سے نکالنے کی خاطر کانگرس کے نظریہ کو قبول کر لیا اور یہ نظریہ پیش کیا کہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں تو علامہ موصوف نے اُن کو درج ذیل رباعی لکھ کر بھیجی ؎

عجم ہنوز نہ داند رموزِ دین ورنہ   ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی ست
سرود بر سر منبر کہ قوم از وطن است   چہ بے خبر ز مقامِ محمد عربی ست

اسی طرح ایک وقت تھا جب علامہ موصوف روس کے فلسفہ اشتراکیت سے سخت متاثر تھے اس دور میں آپ نے اشتراکیت کے حق میں بہت سے اشعار قلمبند کئے۔ اور لینن کو وہ

پیغمبر سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ کہتے ہیں ؎

بنسبت پیغمبر ولیکن در فعلِ دارد کتاب

پھر جب آپ نے اسلام کا بنظر غائر مطالعہ کیا تو اس نظریہ اشتراکیت سے تائب ہو گئے۔ چنانچہ لکھتے ہیں ؎

درین آنِ پیغمبر ناحق شناس!
بر مساوات شکم دارد اساس

اِسی طرح کسی وقت آپ تصوف سے اس قدر متاثر تھے کہ آپ کے گھر پر ابنِ عربی کی فتوحات مکیہ کا درس ہوا کرتا تھا پھر جب آپ نے اسلامی تعلیمات کو اپنایا تو اس رہبانیت سے بیزار ہو کر لکھتے ہیں:

گوسفندے در لباس آدم است! حکم او بر جان صوفی محکم است
بر تخیل ہائے او فرماں رواست جامِ او خواب آور و گیتی رباست
قوم ہا از شکرِ او مسموم گشت خفت و از ذوق عمل محروم گشت

غور فرمائیے کہ کیا پیغام نبوت میں بھی ایسے تغیرات کی گنجائش ہے؟ نبی بھی بہر حال انسان ہی ہوتا ہے اگر ملکۂ نبوت کی صورت بھی دوسرے ملکاتِ انسانی کی طرح ہے تو پھر یہ ان تغیرات سے کیوں کر محفوظ رہ سکتا ہے؛ قرآن کی پہلی وحی بلحاظ فصاحت و بلاغت اور ہدایت و ہی درجہ رکھتی ہے جو آخری وحی کا ہے۔ پھر اس کا اپنا دعویٰ ہے کہ اس کلام میں پورے ۲۳ سال کے عرصہ میں کوئی تضاد نظر نہیں آئے گا۔ اس پر نہ ارتقائے فن کا کچھ اثر ہے نہ ارتقائی نظریات کا۔ پھر ہم سرسید کے اس نادر فلسفہ کو کیونکر صحیح قرار دے سکتے ہیں؟

۳۔ وحی کے متعلق یہ شعور کہ وہ ایک نبی کے دِل سے اٹھتی، پھر اسی کے دِل پر گرتی ہے۔ جب اٹھتی ہے تب تو اس منہ سے بے آواز نکلتی ہے۔ البتہ جب گرتی ہے اس وقت منہ سے آواز نکلنے لگتی ہے۔ اور وہ بھی اس حالت میں کہ وہ سمجھتا ہے کہ اس کے پاس کوئی موجود ہے جو اس سے ہم کلام ہو رہا ہے (جیسے قل للہ الامر جمیعًا) یعنی وہ فرضی خارجی ہستی اس نبی کو کچھ بتلا رہی ہے ـــــ اس بات کا واضح اشارہ ہے کہ نبی پر وحی کے نزول کے وقت اس کے ہوش و حواس قائم نہیں ہوتے (نعوذ باللہ من ذٰلک)۔ یہ سوقیانہ تخیل سید صاحب کو شائد ان کے ابلیس ہی نے سمجھایا ہے۔ کسی نبی کے متعلق اس کے متبعین ایسا تصور کبھی برداشت نہیں کر سکتے

اس طرح تو وحی ساری کی ساری مشکوک ہو کر رہ جاتی ہے۔

ہم حیران ہیں کہ آپ نے جبریلؑ کے وجود کی نفی میں جو مجنون کی مثال کا سہارا لیا ہے۔ تو یہ بات بھی آپ کے نظریہ کے خلاف ہے۔ مجنون اسے کہتے ہیں جسے جن پڑ گئے ہوں گے یا جو آسیب زدہ ہو۔ اور سرسیّد جن کے وہ معنی نہیں لیتے جو عام فہم ہیں۔ بلکہ وہ جن سے دیہاتی لوگ مراد لیتے ہیں (تفصیل آگے آئے گی) اب عقدہ بھی سیّد صاحب ہی حل فرما سکتے ہیں کہ مجنوں کے سامنے جو چیز آ کھڑی ہوتی ہے اور اس سے باتیں کرنا اور مجنون سے سوال و جواب ہوتا ہے تو وہ ہستی کیا چیز ہوتی ہے؟

۴۔ پیغامبری کی یہ شرح بھی عجیب ہے کہ وہ خدا تک پیغام لے بھی جاتا ہے اور پھر وہ پیغام واپس بھی لاتا ہے تو پھر اس معاملہ میں خدا کی ضرورت بھی کیا ہے؟ کیا نبی اپنا پیغام خدا کے پاس APROVE کرانے کے لیے جاتا ہے۔ آخر اس ڈبل ڈیوٹی کا فائدہ کیا ہے جو آپ نے پیغمبر کے سر پر ڈال دی ہے؟ فرماتے ہیں کہ وہ آواز بھی ہوتا ہے اور کان بھی۔ خود ہی کہتا ہے خود ہی سنتا ہے۔ اب اس میں خدا کا کیا واسطہ رہا؟ آواز تو اس کی اپنی ہی ہوتی ہے۔ پھر وہ اندر کی بے صوت و بے حرف کلام کب سنتا ہے؟ اور اُسے کیسے سمجھتا ہے؟ عجیب قسم کے گورکھ دھندا میں آپ مسلمانوں کو گھسیٹنا چاہتے ہیں۔

۵۔ یہ بے صوت و بے حرف کلام کا نظریہ خالصتہً معتزلین کا مردود نظریہ ہے۔ وہ خدا کو صفتِ کلام سے عاری قرار دیتے تھے۔ جس کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے۔

۶۔ اب دیکھیے قرآنِ کریم جبریلؑ اور نزول وحی کے متعلق کیا تصوّر پیش کرتا ہے۔ ارشادِ باری ہے:

وما ینطق عن الھویٰ ۝ ان ھو الا وحی
یوحیٰ ۝ علّمہ شدید القویٰ ۝ ذو مرۃ
فاستویٰ ۝ وھو بالافق الاعلیٰ ۝ ثم دنا
فتدلّٰی ۝ فکان قاب قوسین او ادنیٰ ۝
فاوحیٰ الی عبدہ ما اوحیٰ ۝
(النجم ۳-۱۰)

اور (محمدؐ) اپنی نفسانی خواہش سے نہیں بولتا
وہ خدا کی طرف سے وحی ہے جو اس کی طرف
بھیجی جاتی ہے۔ اسے بڑی زبردست
قوت والے نے سکھایا۔ طاقت ور
(جبریل) نے پھر وہ سیدھا اور قائم ہو گیا
آسمان کے اونچے کنارے پر تھا۔ پھر
قریب ہوا اور جھک گیا۔ پھر وہ کمان کے دو گوشوں کے برابر یا اس کے بھی قریب ہو گیا
تو (اس وقت) اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کی طرف وحی کی، جو کچھ کرنا مقصود تھا۔

دیکھ لیجئے ان آیات میں وحی ڈالنے والی کسی خارجی ہستی کا ثبوت ملتا ہے یا نہیں ؟ سورۂ جن میں فرمایا کہ جب وحی اتاری جاتی ہے تو اس بنا پر فرشتے کے اردگرد پہرہ بھی لگایا جاتا ہے۔ تاکہ پوری محفوظیت سے یہ وحی نبی تک پہنچ جائے اور اس میں کسی قسم کی آمیزش نہ ہو۔ ایک دوسرے مقام پر پیغامبر فرشتے کو یعنی جبریل کو رُوح الامین کے لقب سے پکارا گیا ہے۔ یعنی وہ پیغام رسانی میں پوری امانت و دیانت سے کام لیتا ہے۔ یہ ہے اہتمام وحی کو نبی کے دل تک پہنچانے کا۔ اب بتلائیے اس اہتمام و حفاظتِ وحی کو مجنونانہ تخیلات یا ماہرانہ کمالات سے کچھ نسبت ہو سکتی ہے ؟

قرآنِ کریم میں ایک مقام پر دو فرشتوں کے نام بھی آئے ہیں۔ نام اسی چیز کا ہوتا ہے۔ جس کا کوئی علیحدہ تشخص ہو۔ اب دیکھیے ان کے متعلق سید صاحب کیا کہتے ہیں :

جبرئیل اور میکائیل :

"اس سبب سے یہود جبرئیل کو اپنا دشمن سمجھتے تھے اور اس سے عداوت رکھتے تھے، اسی کی نسبت خدا نے فرمایا ہے کہ، جو کوئی جبرئیل کا یا میکائیل کا دشمن ہے۔ بیشک خدا اس کا دشمن ہے۔ مگر جبرئیل و میکائیل کا اس آیت میں حکایۃً نام آنے سے ان کے ایسے وجود پر جیسا کہ یہودیوں نے اور اُن کی پیروی میں مسلمانوں نے تصور کیا ہے، استدلال نہیں ہو سکتا۔" (ایضاً ص ۱۰۶)

"یہود یہ سمجھتے تھے کہ جبرئیل جو ہمارا دشمن ہے۔ وہ آنحضرتؐ کو یہ بات سکھلاتا ہے۔ خدا نے پیغمبر سے کہا کہ" تو کہہ دے کہ ہاں جبرئیل ہی اللہ کے حکم سے میرے دل میں باتیں ڈالتا ہے۔ مگر جو کوئی ان باتوں کا اور فرشتوں کا اور جبرئیل و میکائیل کا اور رسولوں کا دشمن ہے، خدا اس کا دشمن ہے۔ فرشتوں کی دشمنی بیان کرنے کے بعد جبرئیل و میکائیل کا بالتخصیص نام لینا گویا یہود کے خیالات کا اعادہ ہے اور وہ نام مقصود بالذات نہیں ہیں۔ کیونکہ اگر یہودیوں کا یہ خیال نہ ہوتا تو غالباً وہ نام نہ لیے جاتے۔ پس ان دونوں کے نام قرآن میں آنے سے یہ ثابت نہیں ہو جاتا کہ درحقیقت اس نام کے دو فرشتے مع تشخصہما علیحدہ علیحدہ ایسی ہی مخلوق ہیں جیسے زید و عمرؓ" (ایضاً ص ۱۳۰)

اب دیکھیے کہ بحث اس میں نہیں، جبرئیل و میکائیل کے نام یہودیوں نے رکھے تھے یا خدا نے ؟ اگر بالفرض یہودیوں نے ہی رکھے ہوں اور خدا نے ان ناموں کا اعادہ کر دیا ہو تو بھی مضائقہ کی بات نہیں بحث اس میں ہے کہ آیا فرشتے اپنا علیحدہ وجود رکھتے ہیں یا نہیں ؟ اس کے لیے سید صاحب نے کیا

دلیل دی ہے، محض اُن کے خیالات تو قابلِ تسلیم نہیں بن سکتے۔ پھر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ایک بات یہودیوں میں مشہور ہوگئی۔ خواہ وہ کیسے ہوئی۔ پھر مسلمانوں میں آگئی۔ اگر وہ غلط تھی یعنی فرشتوں کے علیحدہ وجود کے تصورات ٹھیک نہ تھے تو اللہ تعالیٰ کو ان کی تردید کرنا چاہیے تھی، نہ کہ اُن کا اعادہ کرکے ان غلط تصورات کو مزید تائید بخشنا چاہیے تھی۔

ابلیس یا شیطان:

سید صاحب ابلیس یا شیطان کو خارجی وجود نہ ہونے کے اعتبار سے فرشتوں کی صف میں لے آئے ہیں۔ اور ابلیس یا شیطان سے مراد لی جاتی ہے۔ انسان کی سرکش قوت یا عقل بیباک۔

قرآن کریم سے شیطان سے متعلق دو باتوں کا پتہ چلتا ہے۔

۱۔ شیطان کی نوع، نوعِ انسانی سے الگ ہے۔ شیطان کا نوعِ انسانی سے کوئی تعلق نہیں۔ جیسا کہ وہ خود خدا کے حضور اپنی برتری کے ثبوت میں کہتا ہے:

خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ — (اے پروردگار!) تُو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور آدم کو مٹی سے۔

۲۔ اُس کی نسل بھی ہے اور اولاد کا سلسلہ چلتا ہے:

كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ۔ الکہف ۵۰ — ابلیس جنوں سے تھا۔ اُس نے اپنے پروردگار کے حکم سے سرتابی کی۔ کیا تم اُس کو اور اُس کی اولاد کو میرے سوا دوست بناتے ہو حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں۔

اب فرمائیے کہ نفس سرکش پر الگ نوع کا اطلاق ہوسکتا ہے، یا اُس کی اولاد کا تصور ہوسکتا ہے؟ ہوسکتا ہے کہ بعض نکتہ سنج قسم کے لوگ شیطان کی اولاد سے مراد "اس نفس سرکش کے اجزاء" مراد لے لیں۔ جیسا کہ وہ دو دو، تین تین اور چار چار پروں والے فرشتوں سے مراد قوت کی کمی بیشی بھی لے لیتے ہیں۔ تو ہم عرض کریں گے کہ ایسی دور از کار تاویلات انہی لوگوں کو مبارک۔ قرآن پہیلیوں کی زبان میں نہیں اُترا۔ اور نہ ہی ہم یہ تسلیم کرنے کو تیار ہیں کہ اس دور سے پہلے کسی نے قرآن کے حقیقی مفہوم کو سمجھا ہی نہ تھا۔

جنّ:

فرشتوں پر ایمان کے سلسلہ میں جنّ کا ذکر بھی از خود آجاتا ہے۔ فرشتوں اور ابلیس و آدم اور

خدا کا مکالمہ قرآن میں کئی بار آیا ہے۔ ابلیس گو فرشتوں میں رہتا تھا، تاہم وہ جنّوں سے تھا۔ جو فرشتوں سے علیحدہ مخلوق تھی۔ اور انسانوں سے بھی۔ کیونکہ انسان مٹی سے پیدا ہوا ہے اور جن آگ سے۔ اب جن بھی چونکہ غیر مرئی مخلوق ہے۔ لہٰذا اس سے بھی سید صاحب نے انکار کر دیا۔ دلیل یہ ہے کہ جن کے معنی پوشیدہ اور اس کا تصور ذہن کو بڑی قد آور، دیو ہیکل صفت کی طرف منتقل کرتا ہے۔ لہٰذا لفظ جن کا اطلاق ان انسانوں پر ہوتا ہے جو آبادیوں سے دُور صحراؤں اور جنگلوں میں رہتے تھے اور شہری لوگوں سے زیادہ طاقتور اور ڈیل ڈول میں زیادہ قوی اور مضبوط تھے۔ چنانچہ سید صاحب اُن جنّوں سے، جو سلیمانؑ کے لیے قلعے، مجسمے، لگن اور تالاب وغیرہ بناتے تھے، دیہاتی صناع مراد لیتے ہیں۔

اب دیکھئے قرآنِ کریم میں دیہاتیوں کے لیے الاعراب اور دیہاتی آبادیوں کے لیے بدو کا لفظ آیا ہے۔ امام راغب صاحب مفردات القرآن کہتے ہیں۔ کہ "جاء کہ من البدو یعنی (آپ کو گاؤں سے یہاں لائے) میں بدو یعنی بادیہ (صحرا) ہے۔ اور ہر وہ مقام جہاں بلند عمارات وغیرہ نہ ہوں اور تمام چیزیں نظر آتی ہوں اسے بدو (بادیہ) کہا جاتا ہے۔ اور البادی کے معنی صحرانشین کے ہیں"

گویا سر سید تو دیہاتیوں کو نظروں سے اوجھل کر کے انھیں جن کہتے ہیں۔ جبکہ امام راغب انھیں خوب نمایاں کر کے اُنھیں دیہاتی کہتے ہیں۔ اور قرآن امام راغب کے قول کی تائید کرتا ہے۔

جنّوں کی آگ سے تخلیق کے بارے میں سید صاحب فرماتے ہیں کہ:

"قوائے بہیمیہ کو جن کا مبدا حرارت غریزی و حرارت خارجی ہے، آگ سے مخلوق ہونا ٹھیک ٹھیک ان کی فطرت بتلاتا ہے" (ایضاً ۵)

اب دیکھیے حرارت غریزی انسان میں اُس وقت سب سے زیادہ ہوتی ہے جب وہ پیدا ہوتا ہے۔ اور جوں جوں وہ بڑا اور پھر بوڑھا ہوتا جاتا ہے، یہ حرارت کم ہوتی جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب انسان پیدا ہوتا ہے اس وقت وہ پورا شیطان یا ابلیس یا جن ہوتا ہے۔ اور جُوں جُوں وہ ارذل العمر کو پہنچتا جاتا ہے وہ انس یا انسان بنتا جاتا ہے۔

جن آج موجود نہیں:

اور بعد میں آنے والے قرآنی مفکر جناب پرویز صاحب جنّوں کی آگ سے تخلیق کے متعلق یوں رقمطراز ہیں کہ:

"جن ایک آتشیں مخلوق تھی جسے اللہ نے انسان سے پہلے پیدا کیا تھا۔ ایسی مخلوق جس میں انسان کی نسبت حرارت غریزی زیادہ تھی۔ اسی اعتبار سے اس مخلوق کے متعلق

کہا گیا ہے کہ وہ آگ سے پیدا ہوئی تھی جس طرح انسان کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ مٹی سے پیدا ہوا ہے ابلیس کے متعلق اس کی قوت سرکشی کی وجہ ہی سے کہا گیا ہے کہ وہ جنوں میں سے تھا۔"

"لفظ جن کے معنی ہیں پوشیدہ، مستور، اوجھل، غیر مرئی۔ جب یہ کرہ ارض سورج سے الگ ہوا ہے تو ایک پگھلا ہوا آتشیں مادہ تھا... تبدل و تحول کے ان ابتدائی ادوار میں یہاں کس قسم کی مخلوق تھی؟ اس کا ہمیں علم نہیں، لیکن وہ مخلوق اب قصۂ پارینہ ہو چکی ہے۔ اس کی جگہ انسانی آبادی نے لے لی.... اس مخلوق سے آج ہمارا تعلق اس کے سوا اور کچھ معلوم نہیں کہ قرآن کریم نے اس کا ذکر کیا ہے، جس پر ہمارا ایمان ہے۔" (ابلیس و آدم ص ۹۷)

چلیے یہ قصہ بھی طے ہوا کہ جن ایک آتشیں مخلوق تھی۔ جو انسانوں سے پہلے یہاں آباد تھی۔ مگر اب وہ قصۂ پارینہ ہو چکی ہے۔ لیکن اس کے بعد وہ خود ہی اعتراف کرتے ہیں کہ جن انسانی دور میں بھی موجود ہیں۔

جن آج بھی موجود ہیں:

"جن و انس دونوں انسانوں ہی کی دو جماعتیں ہیں۔ انس شہروں کی مہذب آبادی، اور جن صحرا کے بادیہ نشین جو شہری آبادی کی نگاہوں سے اوجھل رہتے ہیں، اور بیابانوں میں رہتے تھے۔ لہٰذا قرآن کریم میں جہاں جن و انس کا ذکر ہوگا اُن سے مراد انسانوں کی ہی دو جماعتیں ہوں گی۔" (ابلیس و آدم۔ ص ۱۰۰)

پہلے اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ جن آدم سے پہلے کی مخلوق تھی۔ دوسرے سے یہ معلوم ہوا کہ نہیں وہ آج بھی موجود ہیں اور وہ صحرا نشین قسم کے لوگ ہیں۔ اب تیسرا اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

جن یا ابلیس کی تخلیق آدم کے ساتھ ہوئی:

(۱) "ہر وہ قوت..... جو انسانی نگاہوں سے اوجھل ہو (نظر نہ آسکتی ہو) جن کہلاتی ہے۔ اور انسانی جذبات چونکہ آنکھوں سے دیکھے نہیں جاسکتے اس لیے انھیں اس اعتبار سے جن کہا گیا ہے۔"

(۲) "ابلیس نے جو اپنے متعلق کہا تھا کہ مجھے آگ سے پیدا کیا گیا ہے تو یہ اس سے اس کی خوئے سرکشی کی طرف اشارہ تھا۔" (ایضاً ص ۹۰)

اس اقتباس سے دو باتوں کا پتہ چلتا ہے کہ :

(۱) جنّ صرف بادیہ نشین ہی نہیں۔ بلکہ ہر انسان میں جنّ موجود ہے۔ کیونکہ جذبات ہر شہری اور مہذب میں بھی موجود ہیں۔

(۲) نگاہوں سے اوجھل چیز یا غیر مرئی چیز مثلاً ہوا، گرمی، سردی، عقل، ذہن، جذبات، قوت سامعہ وغیرہ سب کو جنّ کہا جا سکتا ہے۔

(۳) ابلیس یا جنّ کی پیدائش کا تصوّر آدم کی پیدائش سے پہلے ناممکن ہے۔ کیونکہ آپ کے خیال کے مطابق بنی آدم ہی ایک ایسی نوع ہے جس میں سرکشی کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ آپ خود لکھتے ہیں کہ "اس (ابلیس) کی تخلیق شعور آدم کے ساتھ ہوئی اور جب تک اس دنیا میں بنی آدم کا وجود ہے ہر ایک کے ساتھ موجود رہے گا۔" (ایضاً ص ۱۰۳)

دیکھا آپ نے جنّوں کے خارجی وجود سے انکار کے بعد ان دوستوں کو کتنے پینترے بدلنے پڑے ہیں ؛ اب دیکھیے کہ ابلیس کے خارجی وجود کے متعلق درج ذیل آیت کتنی صاف ہے :

ابلیس کے خارجی وجود کا ثبوت :

قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيمٌ (الکہف ۳۴) — اللہ نے ابلیس سے فرمایا۔ جنت سے نکل جا تو مردود ہے۔

تو کیا اللہ نے یہ بات آدمؑ کے سرکش جذبات سے کہی تھی ؟

اِسی طرح قرآنِ کریم میں ایک دوسرے مقام پر ہے :

فَكُبْكِبُوا فِيهَا هُمْ وَالْغَاوُونَ وَجُنُودُ إِبْلِيسَ أَجْمَعُونَ ۝ (الشعراء ۹۴-۹۵) — تو وہ بھی اور گمراہ لوگ بھی دوزخ میں ڈالے جائیں گے اور ابلیس کے سارے لشکر بھی (داخل جہنم ہوں گے)

جنّوں کے خارجی وجود کا ثبوت :

ارشادِ باری ہے :

وَجَعَلُوا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ إِنَّهُمْ لَمُحْضَرُونَ ۝ (الصّٰفّٰت ۱۵۸/۳۷) — اور انھوں نے خدا اور جنّوں میں رشتہ مقرر کر لیا۔ حالانکہ جنات جانتے ہیں کہ وہ خدا کے سامنے حاضر کئے جائیں گے۔

اب ظاہر ہے آج تک کسی جاہل سے جاہل قوم نے دیہاتی لوگوں یا سرکش جذبات کو خدا کا رشتہ دار،

نہیں بنایا۔ بقول پرویز صاحب اب یہ بھوت پریت یا دیوی دیوتا ہی رہ سکتے ہیں لیکن یہ (آیت میں) وہمی اشیاء بھی مراد نہیں لی جاسکتیں۔ کیونکہ وہمی اشیاء کا علم و شعور سے کیا تعلق؟ لہٰذا واضح طور پر ثابت ہوگیا کہ جنّ کوئی علیحدہ مخلوق ہے۔ جو آج بھی موجود ہے۔ اپنا ذاتی تشخص بھی رکھتی ہے اور علم و شعور بھی۔

قِصّہ ابلیس و آدمؑ:

فرشتوں، ابلیس، شیطانوں اور جنّوں کے خارجی وجود سے انکار کے بعد اب سید صاحب آدمؑ کی تشریح ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:

"آدم کے لفظ سے وہ ذات خاص مراد نہیں ہے۔ جس کو عوام الناس اور مسجد کے ملّا باوا آدم کہتے ہیں۔ بلکہ اس سے نوعِ انسانی مراد ہے۔ جیسا کہ تفسیر کشف الاسرار و ہتک الاشعار میں لکھا ہے "ھو ما المقصود بآدم آدم وحدہٗ ... اور خود خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے "لقد خلقنکم ثم صورنکم ثم قلنا للملئکۃ اسجدوا لآدم" پس "کم" کا خطاب کل انسانوں کی طرف ہے۔ اور آدم سے بنی آدم یعنی نوعِ انسانی مراد ہیں۔"

(ایضاً۔ ص ۴۸)

اقتباس بالا میں لفظ آدم کی یہ تشریح پیش کر کے سید صاحب نے مکمل طور پر ڈارون کے نظریہ ارتقاء کے لیے راستہ ہموار کر دیا ہے۔ آدمؑ کی اس نئی تشریح میں آپ نے مشہور و معتبر تفاسیر کو نظر انداز کر کے کسی مجہول تفسیر کشف الاسرار و ہتک الاشعار کا سہارا لیا ہے۔ صاحبِ تفسیر کا نام آپ نے درج نہیں فرمایا۔ کہ اس پر کچھ تبصرہ کیا جاتے۔ البتہ تفسیر کے نام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صاحبِ تفسیر نے قرآن کو اسرار و رموز کا مجموعہ سمجھ رکھا ہے۔ اور مصنّف صاحب ان سربستہ رازوں کو کھولنے اور پردوں کو ہٹانے کی کوشش فرما رہے ہیں۔ اور جو اسرار انھوں نے بیان فرمائے وہ سیّد صاحب کے مطلب کی چیز تھی باطنی فرقہ کے لوگوں نے بھی قرآن کے ساتھ یہی کچھ کیا تھا۔ اب اگر صاحبِ تفسیر اور اُن کے تتبّع میں سید صاحب بھی یہی کچھ کر لیں تو کیا مضائقہ ہے۔

رہی یہ بات کہ لقد خلقنکم سے یہ سمجھنا کہ آدمؑ سے پہلے بنی نوع انسان یا بنی آدمؑ بکثرت موجود تھے تو یہ کئی لحاظ سے غلط ہے:

۱- جہاں بنی آدم کے تذکرہ کی ضرورت تھی وہاں اللہ تعالیٰ نے بنی آدمؑ کا لفظ ہی استعمال کیا ہے۔ جیسا کہ فرمایا ولقد کرمنا بنی آدم۔ آدمؑ کا قصہ قرآن میں بیسیوں مقامات پر مذکور ہے لیکن کسی جگہ بھی آدمؑ

کے بدل بنی آدم کا لفظ استعمال نہیں ہوا۔ اس سے صاف واضح ہے کہ آدم سے مراد بنی نوع انسان یا بنی آدم کا نمائندہ نہیں بلکہ مخصوص فرد واحد ہے۔

۲۔ یہ آدمؑ ایک برگزیدہ انسان تھے اور اُن کا ذکر چونکہ حضرت نوحؑ کے ساتھ ہوا ہے لہٰذا ظن غالب یہی ہے کہ وہ نبی تھے۔ ارشادِ باری ہے:

ان اللہ اصطفیٰ اٰدم ونوحًا واٰل ابراھیم واٰل عمرٰن علی العٰلمین ۝ آل عمران ۳۳/۳

"بیشک خدا نے آدمؑ اور نوحؑ اور آلِ ابراہیمؑ اور آلِ عمران کو تمام جہان کے لوگوں میں منتخب فرمایا تھا"

۳۔ درج ذیل آیت حضرت آدمؑ کی نبوت پر واضح دلیل ہے:

فتلقی اٰدم من ربہ کلماتٍ فتاب علیہ۔ البقرہ (۳۷/۲)

پھر آدمؑ نے اپنے پروردگار سے کچھ کلمات سیکھے تو اللہ نے اُس کی توبہ قبول فرمائی۔

مندرجہ بالا آیت میں "فتاب علیہ" کے الفاظ اس بات پر شاہد ہیں کہ یہاں کوئی اصول نہیں بیان کیا جا رہا، بلکہ کسی فردِ واحد کی توبہ کی قبولیت کی اطلاع دی جا رہی ہے۔ جو بغیر وحی کے ممکن نہیں۔ لہٰذا حضرت آدمؑ فردِ واحد اور برگزیدہ انسان اور نبی تھے۔

ان تصریحات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ آدمؑ سے پہلے بنی آدمؑ موجود نہیں ہو سکتے۔ اب ہم سید صاحب کی اس دلیل کا جائزہ لیتے ہیں جو اس طرح شروع ہوتی ہے:

ولقد خلقناکم ثم صورنٰکم ثم قلنا للملئکۃ اسجدوا لاٰدم۔ الاعراف (۱۱/۷)

"اور بیشک ہم نے تمھیں پیدا کیا، پھر صورت بنائی۔ پھر فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو۔"

اس آیت میں "ثم قلنا" کے لفظ سے آپ نے یہ استدلال کیا ہے کہ اس قصہ آدم سے پیشتر بنی نوع انسان موجود تھے۔ جن کے لیے جمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ یہ آیت سورہ اعراف کی نمبر ۱۱ ہے۔ درمیان میں سے کسی آیت کا ٹکڑا پیش کر کے مقصد برآری کوئی مستحسن فعل نہیں ہوتا۔ اس آیت کے مخاطب دورِ نبوی کے لوگ ہیں۔ اگر سورہ کو شروع سے پڑھ لیا جائے تو ذہن خود بخود صاف ہو جاتا ہے۔ آیت ۳ سے مسلسل مضمون چلا آ رہا ہے اور وہ یوں شروع ہوتی ہے:

اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم۔ الاعراف (۳/۷)

"لوگو! جو کتاب تم پر تمھارے پروردگار کی طرف سے نازل ہوئی ہے اُس کی پیروی کرو۔"

تو یہاں لفظ خلقنا کو سے مراد حضرت آدمؑ ہیں۔ لیکن مخاطب چونکہ عوام الناس ہیں۔ جو کہ بنی آدم ہی ہیں۔ اس لیے جمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ جب فاعل یا مفعول ایک یا ایک سے زیادہ ہوں۔ تو ضمیر واحد بھی استعمال ہو سکتی ہے اور جمع کی بھی۔ جیسا کہ قرآن میں قصۂ موسیٰ و خضر میں استعمال ہوئی ہیں۔ حضرت خضر موسیٰؑ کو تینوں واقعات کی تاویل بتلاتے ہیں۔ تو پہلے واقعہ کے لیے اَرَدْتُ واحد متکلم کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ اور دوسرے واقعہ کی تاویل بیان کرتے وقت فَاَرَدْنَا جمع متکلم کا۔ حالانکہ کشتی توڑنے میں خدا اور اس کی مشیت کو بھی ایسا ہی دخل تھا جیسے لڑکے مار دینے میں۔

قصۂ آدم میں گفتگو کے فریق :

پھر سید صاحب فرماتے ہیں کہ :

"اس قصہ میں چار فریق بیان ہوئے ہیں، ایک خدا، دوسرے فرشتے (یعنی قوائے ملکوتی)۔ تیسرے ابلیس یا شیطان (یعنی قوائے بہیمی) چوتھے آدم (یعنی انسان جو مجموعہ ان قویٰ کا ہے۔ اور جس میں مرد و عورت دونوں شامل ہیں) مقصود قصہ کا انسانی فطرات کی زبانِ حال سے انسان کی فطرت بیان کرنا ہے۔ خدا جو سب کا پیدا کرنے والا ہے۔ گویا قوائے ملکوتی کو مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ میں ایک مخلوق یعنی انسان کثیف مادہ سے پیدا کرنے والا ہوں۔ مگر وہی میرا نائب ہونے کے لائق ہے۔ جب میں اس کو پیدا کر چکوں تو تم سب اس کو سجدہ کرنا۔ اس مقام پر مخاطبین کو (یعنی قوائے ملکوتی کو مؤلف) اس بات کا کہ اس مخلوق (یعنی انسان) میں قوائے بہیمیہ (یعنی ابلیس یا شیطان) بھی موجود ہوں گے" عالم قرار دیا گیا ہے۔ اور بمقتضائے فطرت ان قویٰ کے، انھوں نے کہا کہ کیا تو ایسے کو خلیفہ کرے گا۔ جو زمین پر فساد مچاوے اور خون بہاوے اور قوائے ملکوتی نے اپنی فطرت اس طرح بیان کی کہ ہم تو تیری ہی تعریف کرتے ہیں۔ اور تجھ پاک کو یاد کرتے ہیں۔"

اب دیکھیے کہ جو منظر کشی سید صاحب نے پیش فرمائی ہے۔ اس میں نہ وہ فرشتوں کا خارجی وجود تسلیم کرتے ہیں نہ ابلیس یا شیطان کا۔ باقی رہ گئے دو یعنی خدا اور انسان، خدا بھی غیر مرئی ہستی ہے۔ اب میدان میں صرف ایک فریق یعنی انسان رہ گیا۔ وہ بھی کوئی متعین ہستی نہیں۔ پھر اس کا زمانہ بھی انسانی گرفت سے ماورا رہے۔ تو یہ بات کیا ہوئی؟ قرآن نے جو اس واقعہ کو بیسیوں مقامات پر دہرایا ہے۔ تو کیا یہ محض ایک ڈرامہ ہی تھا؟ چلیے ہم اسے سید صاحب کے بقول تمثیل یا ڈرامہ ہی سمجھ لیتے ہیں۔ تو کیا کبھی ایسا ڈرامہ بھی منظر عام پر آیا ہے جس کا کوئی معین کردار بھی میدان میں موجود نہ ہو؟

سید صاحب سب باتوں میں زبانِ حال کا سہارا لیتے ہیں۔ تو ابنِ ملکوتی نے بھی زبانِ حال ہی سے یہ کہا کہ ہم اپنے مقرر شدہ کام میں سرگرم عمل رہیں گے۔ لیکن زبانِ حال سے یہ کیسے کہہ دیا کہ "ہم تجھ پاک کو یاد کرتے ہیں؟"

زبانِ حال کے ثبوت میں سید صاحب قرآن میں مذکورہ واقعہ بیان کرتے ہیں کہ:

"خدا نے زمین و آسمانوں سے کہا کہ تم طوعًا حاضر ہو یا کرہًا؟ تو ان دونوں نے زبانِ حال سے کہا کہ ہم طوعًا آئے ہیں۔"

تو یہ مثال یہاں فِٹ نہیں بیٹھتی۔ کیونکہ زمین و آسمان متعین مرئی اور مادی اشیاء ہیں۔ (گو سید صاحب آسمان کو مادی چیز نہ سمجھیں لیکن ہم ضرور سمجھتے ہیں) اب اِن کرداروں کے متعلق تو زبانِ حال کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جہاں چار کرداروں میں سے میدان میں ایک کردار بھی موجود نہ ہو۔ جس کے متعلق انسان واضح تصور رکھ سکتا ہو۔ اور پھر اُن کی ہر بات زبانِ حال کے سپرد کر دی جائے۔ تو کیا اس سے یہ بہتر نہیں کہ اس واقعہ کا سرے سے انکار ہی کر دیا جائے؟

جنّت، شجرِ ممنوعہ اور ہبطِ آدم کی تاویلات:

جنّت کے متعلق ــــ جس میں آدم اور اس کی بیوی کو رہنے کو کہا گیا تھا۔ یہ اختلاف تو رہا ہے کہ آیا وہ جنّت آسمانوں پر تھی یا زمین پر؟ کیونکہ ہبوط کے معنی گرنا اور گِرانا کے بھی آتے ہیں، تو بے آبرو ہو کر نکلنے اور نکالنے کے بھی۔ معتزلہ یا کچھ دوسرے لوگ اس بات کے قائل تھے کہ یہ جنّت زمین پر تھی حتّٰی کہ معتزلہ نے اس کی جگہ بھی بتلا دی کہ وہ فلسطین میں یا فارس و کرمان کے درمیان تھی۔ لیکن سید صاحب نے اس واقعہ کی جو تاویل فرمائی ہے۔ وہ بس اپنا جواب آپ ہی ہے۔ فرماتے ہیں:

"اس کے بعد خدا نے انسان کی زندگی کے دونوں حصّوں کو بتایا ہے۔ پہلے حصّہ کو یعنی جبکہ انسان غیر مکلف اور تمام قیود سے مبّرا ہوتا ہے، بہشت میں رہنے اور چین کرنے اور میووں کے کھاتے رہنے سے تعبیر کیا ہے۔ اور جب دوسرا حصّہ اُس کی زندگی کا شروع ہونے والا ہے، تو اس کے قدیم دشمن (شیطان) کو پھر بلایا ہے، جس نے اس کو بہکا کر درخت ممنوعہ کھلایا ہے۔"

"یہ وہ حصّہ انسان کی زندگی کا ہے جبکہ اُس کو رُشد ہوتا ہے اور عقل و تمیز کے درخت کا پھل کھا کر مکلف اور اپنے تمام اقوال و افعال و حرکات کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ زندگی کے ضروری سامان کے لیے خود محنت کرتا ہے اور نیک و بد کو خود سمجھتا ہے۔ اپنی بدی

سے واقف ہوتا ہے اور اس کو چھپاتا ہے۔ یہ فطرتِ انسانی خدا تعالیٰ نے باغ کے استعارہ میں بیان کی ہے۔ سن رشد و تمیز کو پہنچنے کو درخت، معرفت خیر و شر کو پھل کھانے سے اور انسان کا اپنی بدیوں کے چھپانے کو درخت (جنت یا بچپن کی عمر کے درختوں) کے پتوں کے ڈھانکنے سے تعبیر کیا ہے۔ مگر شجرۃ الخلد تک اس کو نہیں پہنچایا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ فانی وجود ہے اور اس کو دائمی بقا نہیں! اخیر کو نہایت عمدگی سے اس کا خاتمہ بیان کیا ہے کہ تم سب نکل جاؤ اور جا کر زمین پر رہو۔ وہی تمہارے ٹھہرنے کی جگہ ہے۔ اس میں تم رہو گے، اس میں مرو گے، اس میں سے اٹھو گے۔" (ایضاً۔ ص ۵۹)

اقتباس بالا سے مندرجہ ذیل نتائج اخذ ہوتے ہیں:

۱۔ جنت سے مراد سن بلوغت سے پہلے کی عمر ہے، جسے بادشاہی عمر بھی کہتے ہیں۔

۲۔ شجر ممنوعہ سن بلوغت کو پہنچ جانے کا نام ہے۔

۳۔ جب کوئی انسانی بچہ اس سن بلوغت کو پہنچ جاتا ہے تو شیطان آموجود ہوتا ہے۔ اور اسی وقت یہ مکالماتی ڈرامہ ۔۔ جو چار کرداروں پر مشتمل ہے ۔۔ پیش آتا ہے۔

۴۔ سن بلوغت سے بعد کی عمر ہی ہبوط آدم ہے۔ پھر جو کوئی شجر ممنوعہ کو چکھ لیتا ہے تو اُسے اپنی بدی کو سن بلوغت سے پہلے کی عمر کے پتوں سے چھپانا پڑتا ہے۔ اور اگر۔

۵۔ نہایت عمدگی سے بیان کیا جائے۔ ہبوطِ آدم سے مراد زمین پر رہنا ہے۔

اب دیکھئے ان تاویلات پر مندرجہ ذیل اعتراضات وارد ہوتے ہیں:

۱۔ سن بلوغت سے پہلے ہر انسان اکیلا ہوتا ہے۔ اس بادشاہی یا جنت کی زندگی میں اس کے زوج کا تصور ناممکن ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے آدم اور اس کی بیوی دونوں کو جنت میں رہنے کو کہا تھا۔ اس لیے یہ تاویل غلط ہے۔

(۲) شجر ممنوعہ کو کھانے یا نہ کھانے کو آدمؑ کو اختیار دیا گیا تھا مگر سید صاحب کے شجر ممنوعہ (سن رشد و تمیز) کو کھانے پر ہر انسان اپنے طبعی تقاضوں کے تحت مجبور ہوتا ہے۔ ورنہ ان میں اکثر ذمہ داری کی زندگی کو قبول ہی کرتے اور ہمیشہ بادشاہی عمر یا جنت میں ہی رہنا پسند کرتے۔

(۳) شجر ممنوعہ کو آدم اور اس کی بیوی نے شیطان کے بہکانے پر چکھا تھا۔ مگر اس تاویل کے تحت ہر کوئی مرد ہو یا عورت (بلا شرط زوجین) از خود چکھتا ہے۔ کیونکہ وہ اس پر مجبور ہوتا ہے۔

(۴) مکلفانہ زندگی میں قدم رکھنا انسان کا طبعی تقاضا ہے اور طبعی تقاضوں پر ہبوط یا بے آبروئی کا

اطلاق نہیں ہو سکتا۔

۵۔ نہایت عمدگی سے بیان کے مطابق ہبوطِ آدم سے مراد انسان کا زمین پر رہنا ہے۔ تو کیا ہبوط سے پہلے کی زندگی (یعنی جنت یا بچپن کی زندگی) میں انسان زمین پر نہیں رہتا؟ پھر یہ ہبوط کیا ہوا؟

سو یہ ہیں سر سید مرحوم کی تاویلات کے نمونے۔ پھر آپ نے ان تاویلات میں جو ذہنی کاوش فرمائی اُس کی ہم داد ہی دیں گے۔ کیونکہ ان تاویلات سے آپ نے ہر بات کو مطابق فطرت بھی کر دکھلایا ہے اور ڈاروِن کے نظریۂ ارتقاء کے مطابق بھی۔ قرآنِ کریم میں ایسے اسرار و رموز کی حکمت آپ یہ بیان فرماتے ہیں کہ:

" اصل یہ ہے کہ ان آیتوں میں خدا تعالیٰ انسان کی فطرت کو اور اس کے جذبات کو بتلاتا ہے اور جو قوائے بہیمیہ اس میں ہیں۔ ان کی بُرائی یا ان کی دشمنی سے اس کو آگاہ کرتا ہے مگر یہ ایک نہایت دقیق راز تھا۔ جو عام لوگوں کے اور اونٹ چرانے والوں (یعنی صحابہؓ) کے فہم سے بہت دُور تھا۔ اس لیے خدا نے انسانی فطرت کی زبانِ حال سے، آدم و شیطان کے قصّے، خدا اور فرشتوں کے مباحثہ کے طور پر اس فطرت کو بیان کیا ہے تاکہ ہر کوئی خواہ اس کو فطرت کا راز سمجھے، خواہ فرشتوں اور خدا کا مباحثہ، خواہ شیطان و خدا کا جھگڑا، اصلی عقیدہ حاصل کرنے سے محروم نہ رہے۔ اس پر عام و خواص، سمجھ دار اور ناسمجھ، جاہل و عالم کا یکساں قرآن مجید سے مقصد پانا درحقیقت بہت بڑا معجزہ قرآن کا ہے۔"

(ایضاً ص ۴۲/ ج ۱)

ترجمان کے ایک دیرینہ رفیق نصر اللہ دفتری گذشتہ ماہ اللہ کو پیارے ہو گئے!

مرحوم نے الحدیث اخبارات و رسائل کی مدّت مدید تک خدمت کی — وہ مزدوری صرف بائینڈنگ (تجلید) کی لیتے تھے، لیکن اپنے خدمت دینی کے جذبہ کی بنا پر وہ کاغذ کی خریداری، پریس کو پرچہ جلدی چھاپنے کی تاکید — حتیٰ کہ انتظامیہ کو بھی یہ یاددہانی کہ "پرچہ لیٹ ہو رہا ہے" اپنے فرائض میں شامل کر چکے تھے۔

مرحوم پر جب دِل کا جان لیوا حملہ ہُوا، اُس وقت بھی وہ ترجمان الحدیث کے جون کے شمارہ کی تیاریوں میں مصروف تھے۔

اللہ ربّ العزت کی بارگاہ میں ہم دستِ بدعا ہیں کہ وہ مرحوم کی جملہ انسانی کوتاہیوں سے درگزر فرماتے ہوئے انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ اور اُن کے پس ماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ❖